

# تفسیر القرآن

## النور

(۴)

جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں۔ اس طعنے کو اپنے حق سے اٹھانے سے اس الزام کی طرف جو حضرت عائشہ پر لگایا گیا تھا۔ اس کو انک کے لفظ سے تعبیر کرنا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس الزام کی مکمل تردید ہے۔ انک کے معنی میں بات کو الٹ دینا حقیقت کے خلاف کچھ سے کچھ بنانا۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ قطعی جھوٹ اور افتراء کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور اگر کسی الزام کے لیے بولا جائے تو اس کے معنی سراسر بہتان کے ہیں۔

یہاں سے اس واقعے پر کلام شروع ہونا ہے جو اس سوسے کے نزول کا اصل سبب تھا۔ دیباچے میں ہم اس کا ابتدائی قصہ خود حضرت عائشہ کی روایت سے نقل کر آئے ہیں بلکہ وہ داستان بھی انہی کی زبان سے سنئے۔ فرماتی ہیں: میں بہتان کی افواہیں کم دہش ایک جہینے تک شہر میں اڑتی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور بیخ و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کل ایک روز حضور تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے اس پوری مدت میں آپ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکر اور اہل بیت و ان حضرت عائشہ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے، اس لیے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ حضور نے فرمایا عائشہ مجھے تمہارا متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں، اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تمہاری برأت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر وہ قسمی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو، اور معافی مانگو، بندہ حسب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے میں نے اپنے والد سے عرض کیا آپ رسول اللہ کی برأت کا جواب دیں، انہوں نے فرمایا بیٹی، میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہوں میں نے اپنی والدہ سے کہا آپ ہی کچھ کہیں۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ

میں حیران ہوں، کیا کہوں۔ اس پر میں بولی آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور لوگوں میں مٹی چھلکی ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ تو آپ لوگ نہ مانیں گے، اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی۔ اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی۔ تو آپ لوگ مان میں گئے۔ میں نے اس وقت حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر نہ یاد آیا۔ آخر میں نے کہا اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ فَصَبِّرْ جَمِيلًا (اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جبکہ حضرت یعقوب کے سامنے ان کے بیٹے بن یمن پر چوری کا الزام بیان کیا گیا تھا۔ سورہ یوسف، رکوع ۱۰ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی میں اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دیگا۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وہی نازل ہوگی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی سستی کو اب سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری برأت ظاہر فرما دیگا۔ اتنے میں یکایک حضور پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو وہی نازل ہونے وقت ہوا کرتی تھی، حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی۔ مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کالو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دُور ہوئی تو حضور بے حد خوش تھے۔ آپ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہ، اللہ نے تمہاری برأت نازل فرمادی۔ اور اس کے بعد حضور نے دس آیتیں سنائیں (یعنی آیت نمبر ۱۱ سے نمبر ۲۱ تک)۔ میری والدہ نے کہا کہ اٹھو اور رسول اللہ کا شکر یہ ادا کرو۔ میں نے کہا میں نہ ان کا شکر یہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا، بلکہ اللہ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری برأت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا (واقعہ رہے کہ یہ کسی ایک روایت کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ حدیث اور عبرت کی کتابوں میں جتنی روایتیں حضرت عائشہ سے اس سلسلے میں مروی ہیں ان سب کو جمع کر کے ہم نے ان کا خلاصہ نکال لیا ہے)۔ اس موقع پر یہ نکتہ لطیف بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت عائشہ کی برأت بیان کرنے سے پہلے پورے ایک رکوع میں زنا اور زحف اور لعان کے احکام بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے دراصل اس حقیقت پر متنبہ فرمایا ہے کہ زنا کے الزام

میں شہر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہوتے۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے آنا ہی گناہ مہینا کا معاملہ کوئی تفریحی مشغلہ نہیں ہے جسے نقل و حمل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ ایک نہایت سنگین بات ہے۔ الزام لگانے والے کا الزام اگر سچا ہے تو وہ گواہی لائے۔ زانی اور زانیہ کو انتہائی ہوننا کم مزادی جائے گی۔ اگر جھوٹا ہے تو الزام لگانے والا اس لائق ہے کہ اس کی پیٹھی پر ۸۰ کوزے برسادیئے جائیں تاکہ آئندہ وہ یا کوئی اور ایسی جرأت نہ کرے۔ اور یہ الزام اگر شوہر لگائے تو عدالت میں معاف کر کے اسے معاملہ صاف کرنا ہوگا۔ اس بات کو زبان سے نکال کر کوئی شخص بھی خیریت سے بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ یہ مسلم معاشرہ ہے جسے دنیا میں بھلائی قائم کرنے کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ اس میں نہ زنا ہی تفریح بن سکتی ہے اور نہ اس کے چرچے ہی خوش باشی اور دل لگی کے موضوع قرار پاسکتے ہیں۔

فقہ روایات میں صرف چند آدمیوں کے نام ملتے ہیں جو یہ افواہیں پھیلا رہے تھے۔ عبد اللہ بن ابی زید بن قاف (جو غالباً رفاعہ بن زید یہودی منافق کا بیٹا تھا)۔ مسطح بن اثاثہ۔ سمان بن ثابت اور محمد بن زینب نخعی۔ ان میں سے پہلے دو منافق تھے اور باقی تین مومن تھے جو غلطی اور کمزوری سے اس فتنے میں پڑ گئے تھے۔ ان کے سوا اور جو لوگ اس گناہ میں کم و بیش مبتلا ہوئے ان کا ذکر حدیث و سیرت کی کتابوں میں نظر سے نہیں گزرا۔

نقلہ مطلب یہ ہے کہ گھبرائو نہیں، منافقین نے اپنی دانست میں تو یہ بڑے زور کا وارنم پر کیا ہے گواہی انشاء اللہ یہ اپنی پرائیڈ کے گناہ تمہارے لیے مفید ثابت ہوگا۔ جیسا کہ ہم دیکھا ہے میں بیان کر آئے ہیں۔ منافقین نے یہ شوشہ اس لیے چھوڑا تھا کہ مسلمانوں کو اس میدان میں شکست دیں جو ان کے نفوق کا اصل میدان تھا، یعنی حلاق جس میں نفاق ہونے ہی کی وجہ سے وہ ہر میدان میں اپنے حریفوں سے بازی لیے جا رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی مسلمانوں کے لیے سبب خیر بنا دیا۔ اس موقع پر ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، دوسری طرف حضرت ابو بکرؓ ان کے خاندان والوں نے، اور تیسری طرف عام اہل ایمان نے جو طرز عمل اختیار کیا، اس سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہو گئی کہ یہ لوگ برائی سے کس قدر پاک، کیسے ضابطہ و تحمل، کیسے انصاف پسند اور کس وجہ کہیم النفس واقع ہوئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اشارہ ان لوگوں کی گردنیں اُٹا دینے کے لیے کافی تھا جنہوں نے آپ کی عزت پر یہ حملہ کیا تھا، مگر عہدینہ بجز ترک آپ صبر سے سب کچھ برداشت کرتے رہے۔

اور جب اللہ کا حکم آگیا تو صرف ان تین مسلمانوں کو، جن پر حرمِ تقدف ثابت تھا، مدگلوادی، منافقین کو کچھ بھی کچھ نہ کہا۔ حضرت ابو بکر کا اپنا رشتہ دار، جس کی امد میں کے گھر بھر کی وہ کفالت بھی فرماتے تھے، ان کے دل و جگر پر یہ تیر چلانا رہا، مگر اللہ کے اس نیک بندے نے اس پر بھی نہ برداری کا تعلق متنتقل کیا، نہ اس کی امد اس کے خاندان کی مدد ہی بند کی۔ اندراجِ مطہرات میں سے کسی نے بھی سوکن کی بدنامی میں ذرہ برابر حصہ نہ لیا، بلکہ کسی نے اس پر ادنیٰ وجہ سے بھی اپنی رضا اور پسند کا، یا کم از کم قبولیت کا انہماز تک نہ کیا۔ حتیٰ کہ حضرت زینب کی سگی بہن ثمنہ بنت جحش محض اُن کی خاطر اُن کی سوکن کو بدنام کر رہی تھیں، مگر خود انہوں نے سوکن کے حق میں کلمہِ خیر ہی کہا۔ حضرت عائشہ کی اپنی روایت ہے کہ اندراجِ رسول اللہ میں سب سے زیادہ زینب ہی سے میرا مقابلہ رہتا تھا، مگر واقعہً انک کے سلیس ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا کہ عائشہ کے متعلق تم کیا جانتی ہو تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ خدا کی قسم میں اس کے اندر بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتی۔ حضرت عائشہ کی اپنی شرافتِ نفس کا حال یہ تھا کہ حضرت سلمان بن ثابت نے انہیں بدنام کرنے میں نمایاں حصہ لیا، مگر وہ ہمیشہ ان کے ساتھ عزت اور تواضع ہی سے پیش آتی رہیں۔ لوگوں نے یاد دلایا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس نے آپ کو بدنام کیا تھا تو یہ جواب دیکر ان کا منہ بند کر دیا کہ یہ وہ شخص ہے جو مشرکین اسلام شہور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف سے منہ توڑ جواب دیا کرتا تھا۔ یہ تھا ان لوگوں کا حال جن کا اس معاملے سے براہِ راست تعلق تھا اور عام مسلمانوں کی پاکیزہ نفسی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری سے اُن کی بیوی نے جب ان انہما ہوں کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے "ابو ایوب کی ماں، اگر تم عائشہ کی جگہ اُس موقع پر بہتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں؟ وہ بولیں "خدا کی قسم میں یہ حرکت ہرگز نہ کرتی" حضرت ابو ایوب نے کہا "تو عائشہ تم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر صفوان کی جگہ میں ہوتا تو اس طرح کا خیال تک نہ کر سکتا تھا، صفوان تو میرے سے اچھا مسلمان ہے؛ اس طرح منافقین جو کچھ چاہتے تھے، نتیجہً اس کے بالکل برعکس نکلا اور مسلمانوں کا اخلاقی تقویٰ پہلے سے زیادہ نمایاں ہو گیا۔"

پھر اس میں خیر کا ایک اور پہلو بھی تھا، اور وہ یہ کہ یہ واقعہ اسلام کے قوانین و احکام اور تمدنی ضوابط میں بڑے اہم اصنافوں کا موجب بن گیا۔ اس کی بدولت مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ہدایات حاصل ہوئیں جن پر عمل کر کے مسلم معاشرے کو ہمیشہ کے لیے برائیوں کی پیداوار اور ان کی اشاعت سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے،

اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے تو عذابِ عظیم ہے جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟ وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) اور پیدا ہو جائیں تو ان کا بروقت تدارک کیا جاسکتا ہے۔

مزید برآں اس میں شیر کا پہلو یہ بھی تھا کہ تمام مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیبِ واد نہیں ہیں، جو کچھ اللہ بتاتا ہے وہی کچھ جانتے ہیں، اس کے ماسوا آپ کا علم اتنا ہی کچھ ہے جتنا ایک بشر کا ہو سکتا ہے۔ ایک مہینے تک آپ حضرت عائشہ کے معاملے میں سخت پریشان رہے کبھی خادمہ سے پوچھتے تھے کبھی ازواجِ مطہرات سے، کبھی حضرت علیؑ سے اور کبھی حضرت اسامہؓ سے۔ آخر کار حضرت عائشہ سے فرمایا تو یہ فرمایا کہ اگر تم نے یہ گناہ کیا ہے تو توبہ کرو اور نہیں کیا تو امید ہے اللہ تمہاری بے گناہی ثابت کر دے گا۔ اگر آپ عالم الغیب ہوتے تو یہ پریشانی اور یہ پوچھ گچھ اور یہ تلقین توبہ کیوں ہوتی۔ البتہ جب وحی خداوندی نے حقیقت بتا دی تو آپ کو وہ علم حاصل ہو گیا جو مہینہ بھر تک حاصل نہ تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے براہِ راست تجزیے اور مشاہدے کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اس غلو اور مبالغے سے بچانے کا انتظام فرما دیا جس میں عقیدت کا اندھا جوش بالعموم اپنے پیشواؤں کے معاملے میں لوگوں کو مبتلا کرتا ہے۔ بعید نہیں کہ مہینہ بھر تک وحی نہ بھیجے میں اللہ تعالیٰ کے پیش نظر یہ بھی ایک مصلحت رہی ہو۔ اول روز ہی وحی آجاتی تو یہ فائدہ حاصل نہ ہو سکتا۔

اللہ یعنی عبداللہ بن ابی جو اس الزام کا اصل مصنف اور فتنے کا اصل بانی تھا بعض روایات میں غلطی سے حضرت حسان بن ثابت کو اس آیت کا مصداق بتایا گیا ہے، مگر یہ راویوں کی اپنی ہی غلطی تھی جسے وہ نہ حضرت حسان کی کمزوری اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ وہ منافقوں کے پھیلائے ہوئے اس فتنے میں مبتلا ہو گئے۔ حافظ ابن کثیر نے صحیح کہا ہے کہ اگر یہ روایت بخاری میں نہ ہوتی تو قابل ذکر تک نہ تھی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا بھوٹا بلکہ بہتان یہ ہے کہ بنی امیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس آیت کا مصداق قرار دیا۔ بخاری، طبرانی، ابوداؤد، ہیثمی میں ہشام بن عبدالملک اموی کا یہ قول منقول ہے کہ اللہ ہی تو ہی کعبہ کے مصداق علی بن ابی طالب ہیں۔ حالانکہ

حضرت علیؓ کا سر سے اس فتنے میں کوئی حصہ ہی نہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ انہوں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پریشان دیکھا تو حضور کے مشورہ لینے پر عرض کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں آپ پر کوئی تنگی تو نہیں رکھی ہے۔ عورتیں بہت ہیں آپ چاہیں تو عائشہ کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ حضرت علیؓ نے اس الزام کی تصدیق فرمائی تھی جو حضرت عائشہ پر لگایا جا رہا تھا۔ ان کا مقصد صرف آنحضرت کی پریشانی کو رفع کرنا تھا۔

۳۔ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے لوگوں، یا اپنی ملت اور اپنے معاشرے کے لوگوں سے نیک لگن کیوں نہ کیا۔ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں، اور اس دو معنی فقرے کے استعمال میں ایک لطیف نکتہ ہے جسے خوب سمجھ لینا چاہیے جو صورت معاملہ حضرت عائشہ اور صفوان بن معطل کے ساتھ پیش آئی تھی وہ یہی تو تھی کہ قافلے کی ایک خانوں قطع نظر اس سے کہ وہ رسول کی بیوی تھیں، انفاق سے پیچھے رہ گئی تھیں اور قافلے ہی کا ایک آدمی جو خود انفاق سے پیچھے رہ گیا تھا، انہیں دیکھ کر اپنے اوٹ پر ان کو ٹھال لایا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ معاذ اللہ یہ دونوں تنہا ایک دوسرے کو پا کر گناہ میں مبتلا ہو گئے تو اس کا یہ کہنا اپنے ظاہر الفاظ کے پیچھے دو اور مفروضے بھی رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ قافلے (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) اگر خود اس جگہ ہوتا تو کبھی گناہ کیسے بغیر نہ رہتا، کیونکہ وہ اگر گناہ سے رکا ہوا ہے تو صرف اس لیے کہ اسے صنف مقابل کا کوئی فرد اس طرح تنہائی میں ہاتھ نہ آگیا، ورنہ ایسے نادر موقع کو وہ چھوڑنے والا نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ جس معاشرے سے وہ تعلق رکھتا ہے اس کی اخلاقی حالت کے متعلق اس کا لگن یہ ہے کہ یہاں کوئی عورت بھی ایسی نہیں ہے اور نہ کوئی مرد ایسا ہے جسے اس طرح کا کوئی موقع پیش آجائے اور وہ گناہ سے باز نہ جائے۔ یہ تو اس صورت میں ہے جبکہ معاملہ محض ایک مرد اور ایک عورت کا ہو۔ اور بالفرض اگر وہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے ہوں، اور عورت جو اتفاقاً قافلے سے پھڑکی تھی، اس مرد کے کسی دوست یا رشتہ دار یا مہمانے یا واقف کار کی بیوی بہن، یا بیٹی ہو تو معاملہ اور بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی پھر یہ ہو جاتے ہیں کہ کہنے والا خود اپنی ذات کے متعلق بھی اور اپنے معاشرے کے متعلق بھی ایسا سخت گناہ و ناقص تصور رکھتا ہے جسے شرافت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ کون بھلا آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس کے کسی دوست یا مہمانے یا واقف کار کے گھر کی کوئی عورت

اگر اتفاق سے کہیں بھولی جھٹکی اُسے راستے میں بل جاتے تو وہ پہلا کام بس اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے ہی کا کہے گا پھر کہیں اُسے گھر پہنچانے کی تدبیر سمجھے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے ہزار گنا زیادہ سخت تھا۔ خاتون کوئی اور نہ تھیں، رسول اللہ کی بیوی تھیں جنہیں ہر مسلمان اپنی ماں سے بڑھ کر احترام کے لائق سمجھتا تھا، جنہیں اللہ نے خود ہر مسلمان پر ماں کی طرح حرام قرار دیا تھا۔ مرد نہ صرف یہ کہ اسی قافلے کا ایک آدمی، اسی فوج کا ایک سپاہی اور اسی شہر کا ایک شہری تھا، بلکہ وہ مسلمان تھا، اُن خاتون کے شوہر کو اللہ کا رسول اور اپنا ہادی و پیشوا ماننا تھا، اور اُن کے فرمان پر جان قربان کرنے کے لیے جنگ بدر جیسے خطرناک معرکے میں شریک ہو چکا تھا۔ اس صحت حال میں تو اس قول کا ذہنی پس منظر گھٹاؤنے پن کی اُس انتہا کو پہنچ جاتا ہے جس سے بڑھ کر کسی گندے تخیل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ مسلم معاشرے کے جن افراد نے یہ بات زبان سے نکالی یا اسے کم از کم شک کے قابل خیال کیا انہوں نے خود اپنے نفس کا بھی بہت بُرا تصور قائم کیا اور اپنے معاشرے کے لوگوں کو بھی بڑے ذلیل اخلاق و کردار کا مالک سمجھا۔

مسئلہ یعنی یہ بات تو قابلِ عورت تک نہ تھی۔ اسے تو سنتے ہی ہر مسلمان کو سرسرمہوٹ اور کذب و افتراء کہہ دینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے کوئی شخص یہاں یہ سوال کرے کہ جب یہ بات تھی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق نے اسے کیوں ناقابلِ روزی جھٹلایا اور کیوں انہوں نے اسے اتنی اہمیت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شوہر اور باپ کی پوزیشن عام آدمیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک شوہر سے بڑھ کر کوئی اپنی بیوی کو نہیں جان سکتا اور ایک شریف و صالح بیوی کے متعلق کوئی صحیح الدماغ شوہر لوگوں کے بہتانوں پر فی الواقع بدگمان نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس کی بیوی پر الزام لگا دیا جائے تو وہ اس مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ اسے بہتان کہہ کر روک دے تو کہنے والوں کی زبان نہ رُکے گی، بلکہ وہ اس پر اٹل ایک اور دیا بے چڑھائیں گے کہ بیوی نے میاں صاحب کی عقل پر کیسا پردہ ڈال رکھا ہے، سب کچھ کر رہی ہے اور میاں یہ سمجھتے ہیں کہ بیوی بیوی بڑی پاکدامن ہے۔ ایسی ہی مشکل ماں باپ کو پیش آتی ہے۔ وہ غریب اپنی بیٹی کی عصمت پر صریح جھوٹے الزام کی تردید میں اگر زبان کھولیں بھی تو بیٹی کی پوزیشن صاف نہیں ہوتی۔ کہنے والے یہی کہیں گے کہ ماں باپ ہیں، اپنی بیٹی کی حمایت نہ کریں گے تو اور کیا کریں گے۔ یہی چیز تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت

چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پر گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آ لیتا۔ درندہ غور تو کرو، اُس وقت تم کسی سخت غلطی کر رہے تھے، جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور

ابوبکر اور اُمّ سعدان کو اندر ہی اندر غم سے گھلانے دے رہی تھی۔ ورنہ حقیقت میں کوئی شک ان کو لاحق نہ تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خطبے ہی میں صاف فرما دیا تھا کہ میں نے اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اُس شخص میں جس کے متعلق یہ الزام لگایا جا رہا ہے۔

لکھتے اللہ کے نزدیک یعنی اللہ کے قانون میں، یا اللہ کے قانون کے مطابق۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں تو الزام بجائے عموماً جھوٹا تھا، اس کا جھوٹ ہونا اس بات پر مبنی نہ تھا کہ یہ لوگ گواہ نہیں لائے ہیں۔

اس جگہ کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہاں الزام کے غلط ہونے کی دلیل اور بنیاد محض گواہوں کی غیر موجودگی کو ٹھیرا جا رہا ہے۔ اور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم بھی صرف اس وجہ سے اس کو صریح بہتان قرار دو کہ الزام لگانے والے چار گواہ نہیں لائے ہیں۔ یہ غلط فہمی اُس صورت واقعہ کو نگاہ میں نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے جو فی الواقع وہاں پیش آئی تھی۔ الزام لگانے والوں نے الزام اس وجہ سے نہیں لگایا تھا کہ انہوں نے، یا ان میں سے کسی شخص نے وہ بات دیکھی تھی جو وہ زبان سے نکال رہے تھے، بلکہ صرف اس بنیاد پر اتنا بڑا الزام شریف کر ڈالا تھا کہ حضرت عائشہ قافلے سے پیچھے رہ گئی تھیں اور صفوان بعد میں ان کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے قافلے میں لے آئے۔ کوئی صاحب عقل آدمی بھی اس موقع پر یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ حضرت عائشہ کا اس طرح پیچھے رہ جانا، معاذ اللہ کسی ساز باز کا نتیجہ تھا۔ ساز باز کرنے والے اس طریقہ سے تو ساز باز نہیں کیا کرتے کہ سالار لشکر کی بیوی چپکے سے قافلے کے پیچھے ایک شخص کے ساتھ رہ جائے اور پھر وہی شخص اس کو اپنے اونٹ پر بٹھا کر دن دہارے، ٹھیک دوپہر کے وقت لیے ہوئے علانیہ لشکر کے پٹاؤ پر پہنچے۔ یہ صورت حال خود ہی ان دونوں کی معصومیت پر دلالت کر رہی تھی۔ اس حالت میں اگر الزام لگایا جا سکتا تھا تو صرف اس بنیاد پر ہی لگایا جا سکتا تھا کہ کہنے والوں نے اپنی آنکھوں سے کوئی معاملہ دیکھا ہو۔ ورنہ قرآن و جن پر ظالموں نے



اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم نے اسے ایک معمولی بات سمجھا، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات ہے۔ کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زبردستی نہیں دیتا، سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے؛ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور عظیم و حکیم ہے۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو الزام کی بنا رکھی تھو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رکھتے تھے۔

۱۱۰ ان آیات سے، اور خصوصاً اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کہ مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے گروہ کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا، یہ قاعدہ کلیہ نکلتا ہے کہ مسلم معاشرے میں تمام معاملات کی بنا حسن ظن پر ہونی چاہیے، اور سو ظن صرف اس حالت میں لیا جانا چاہیے جبکہ اس کے لیے کوئی ثبوت و ایجابی بنیاد نہ ہو۔ اصول یہ ہے کہ ہر شخص بے گناہ ہے جب تک کہ اس کے مجرم ہونے یا اس پر جرم کا شبہ کرنے کے لیے کوئی مستقول وجہ موجود نہ ہو اور ہر شخص اپنی بات میں سچا ہے جب تک کہ اس کے ساتھ الاعتدال ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو۔

۱۱۱ مرتع و محل کے لحاظ سے تو آیت کا براہ راست مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے الزامات گھڑ کر اور انہیں اشاعت دے کر مسلم معاشرے میں بد اخلاقی پھیلانے اور امت مسلمہ کے اخلاق پر دھبہ لگانے کی کوششیں کر رہے ہیں وہ سزا کے مستحق ہیں۔ لیکن کسرت کے الفاظ فحش پھیلانے کی تمام صورتوں پر حاوی ہیں۔ ان کا اطلاق عملاً بدکاری کے اڈے قائم کرنے پر بھی ہوتا ہے اور بد اخلاقی کی ترغیب دینے والے اور اس کے لیے جذبات کو اکسلنے والے قصوں، اشعار، گانوں، تصویروں اور کھیل تماشوں پر بھی۔ نیز وہ کلب اور بٹول اور دوسرے اوارے بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں جن میں مخلوط قص اور مخلوط نغمات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ ہر سب لوگ مجرم ہیں۔ صرف آخرت ہی میں نہیں دنیا میں بھی ان کو سزا ملنی چاہیے۔ لہذا ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اشاعت فحش کے ان تمام ذرائع و وسائل کا سدباب کرے۔ اُس کے تافرن تفریبات میں ان تمام افعال

یہ چیز جو ابھی تھا ہے اندر پھیلانی گئی تھی بدترین نتائج دکھا دیتی، حتیٰ یہ ہے کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ تو اسے بخش اور بدی ہی کا حکم دے گا۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا۔ مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے، اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔<sup>۱۹</sup> تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجرین سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور کورم نازم سزا قابل و دست انداز ہی نہیں ہونا چاہیے جن کو قرآن یہاں برباد کے خلاف جرائم قرار دے رہا ہے اور فیصلہ کر رہا ہے کہ ان کا ارتکاب کرنے والے سزا کے مستحق ہیں۔

۱۹ یعنی تم لوگ نہیں جانتے کہ اس طرح کی ایک ایک حرکت کے اثرات معاشرے میں کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں۔ کہنے افراد کو متاثر کرتے ہیں اور مجموعی طور پر ان کا کس قدر نقصان اجتماعی زندگی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس چیز کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ لہذا اللہ پر اعتماد کرو اور جن برائیوں کی وہ نشان دہی کر رہا ہے انہیں پوری توجہ سے مٹانے اور بانی کی کوشش کرو۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں ہیں جن کے ساتھ معاوامی برقی جائے۔ اور اصل یہ بڑی باتیں ہیں جن کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزا مہنی چاہیے۔

۲۰ یعنی شیطان تو تمہیں بڑائی کی نجاتوں میں اکوہ کرنے کے لیے اس طرح تلا بیٹھا ہے کہ اگر اللہ اپنے فضل و کرم سے تم کو نیک و بد کی تمیز نہ سجاتے اور تم کو اصلاح کی تعلیم و توفیق سے نہ نوازے تو تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے بل بوتے پر پاک نہ ہو سکے۔

۱۹ یعنی اللہ کی یہ مشیت، اکوہ کے پاکیزگی بخشنے، اندھا دھند نہیں ہے بلکہ علم کی بنا پر ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کس میں بھلائی کی طلب موجود ہے اور کون برائی کی رغبت رکھتا ہے۔ ہر شخص اپنی غلطیوں میں بھی جو باتیں کرتا ہے انہیں اللہ سن رہا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے دل میں بھی جو کچھ سوچتا ہے، اللہ اس سے بے خبر نہیں رہتا۔ اسی براہ راست علم کی بنا پر اللہ فیصلہ کرتا ہے کہ کسے پاکیزگی بخشنے اور کسے نہ بخشنے۔

رحیم ہے۔

۱۷۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ منکودہ بالا آیتوں میں جب اللہ تعالیٰ نے میری برائت نازل فرمادی تو حضرت ابو بکر نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ کے لیے مسلح بن اٹاؤں گی مدوسے ہاتھ کھینچ لیں گے، کیونکہ انہوں نے نہ رشتہ داری کا کوئی لحاظ کیا اور نہ ان اسماوات ہی کی کچھ شرم کی جو وہ ساری عمر ان پر امدان کے خاندان پر کرتے رہے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کو سنتے ہی حضرت ابو بکر نے فرما لیا یا علی واللہ اننا نغفر لنا یا ربنا واللہ ضرور ہم چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہماری غلطیاں معاف فرمائے، چنانچہ آپ نے پھر مسلح کی مدد شروع کر دی اور پہلے سزا دی اور ان پر احسان کرنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ یہ قسم حضرت ابو بکر کے علاوہ بعض اور صحابہ نے بھی کھالی تھی کہ جن جن لوگوں نے اس جہان میں حصہ لیا ہے ان کی وہ کوئی مدد نہ کریں گے۔ اس آیت کے نزول کے بعد ان سب نے اپنے عہد سے رجوع کر لیا اس طرح وہ تلخی آنا نانا میں دم نہ ہو گئی جو اس وقت سے پھیلا دی تھی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھائے، پھر بعد میں اسے معلوم ہو کہ اس میں بھلائی نہیں ہے اور وہ اس سے رجوع کر کے وہ بات اختیار کر لے جس میں بھلائی ہے تو آیا اسے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا چاہیے یا نہیں؟ فقہاء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہی قسم کا کفارہ ہے، اس کے سوا کسی اور کفارے کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر کو قسم توڑنے کا حکم دیا اور کفارہ ادا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بھی وہ دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ من حلف علی یمین فداؤ غیبرا خیرا منھا فلیات الذی هو خیر و ذالک کفارۃ و ذم شخص کسی بات کی قسم کھائے، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے تو اسے وہی بات کرنی چاہیے جو بہتر ہے اور یہ بہتر بات کو اختیار کر لینا ہی اس کا کفارہ ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قسم توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک صاف اور مطلق حکم نازل فرما چکا ہے (تفسیر القرآن ج ۱، ص ۱۷۱، ۱۷۰) جسے اس آیت نے تو منسوخ ہی کیا ہے اور نہ صاف الفاظ میں اس کے اندر کوئی ترمیم ہی کی ہے اس لیے وہ حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہاں حضرت ابو بکر کو قسم توڑ دینے کے لیے تو ضرور فرمایا ہے مگر یہ نہیں فرمایا کہ تم پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہے۔

جر لوگ پاک دامن، بے خبثت، مومن عورتوں پر تمہیں لگاتے ہیں ان پر دنیا ادا آفرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے پلٹے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھر لپے دے دیگا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کہہ دینے والا۔

نجیبت عمدتین نصیبت مردوں کے لیے ہیں اور نجیبت مرد و نجیبت عمدتوں کے لیے پاکیزہ عمدتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد و پاکیزہ عورتوں کے لیے، ان کا دامن پاک ہے ان باتوں سے جو زندانے والے بنا تے ہیں، ان کے لیے مغفرت ہے اور ذوق کریم با

وہابی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک غلط یا نامناسب بات کی قسم کھانے سے جو گناہ ہوتا ہے وہ مناسب بات اختیار کر لینے سے وصل جاتا ہے۔ اس ارشاد کا مقصد کفارہ قسم کو ساقط کر دینا نہیں ہے چنانچہ دوسری حدیث اس کی توضیح کرتی ہے جس میں حضور نے فرمایا ہے من حلف علی یمن فداؤی غیوہا خیراً منھا فلیات الذی ہو خیر و لیس کفر عن یمینم (جس نے کسی بات کی قسم کھالی ہو، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے، اسے چاہیے کہ وہی بات کرے جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قسم توڑنے کا کفارہ اور چیرنے اور بھلائی نہ کرنے کے گناہ کا کفارہ اور چیرنے ایک چیز کا کفارہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہے اور دوسری چیز کا کفارہ وہ ہے جو قرآن نے خود مقرر کر دیا ہے۔

اللہ اصل میں لفظ غافلالت استعمال ہوا ہے جس سے مراد ہیں وہ سیدھی سادھی شریف عورتیں جو چھل بٹے نہیں جانتیں، جن کے دل پاک ہیں، جنہیں کچھ خبر نہیں کہ بد چینی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے، جن کے سامنے خیال میں بھی یہ اندیشہ نہیں گزرتا کہ کبھی کوئی ان پر بھی الزام لگا بیٹھے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پاک دامن عورتوں پر تمہیں لگانا ان سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو مہلقات توتیہ کن ہیں اور طہرانی میں حضرت صدیق اکبر کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا قذف المحصنة یهدم عمل مائة سنة، ایک پاک دامن عورت پر تمہیں لگانا سو برس کے اعمال کو غارت کر دینے کے لیے کافی ہے۔

لکھ اس آیت میں ایک اصولی بات سمجھائی گئی ہے کہ نجیبتوں کا جوہر نجیبتوں ہی سے لگتا ہے اور پاکیزہ لوگ

پاکیزہ لوگوں ہی سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ ایک بدکار آدمی صرف ایک ہی برائی نہیں کیا کرتا ہے کہ اور تو سب جینتیوں سے وہ بالکل ٹھیک ہو گا مگر بس ایک برائی میں مبتلا ہو۔ اس کے تو اطوار، عادات، خصائل ہر چیز میں بہت سی برائیاں ہوتی ہیں جو اس کی ایک بڑی برائی کو سہارا دیتی اور پرورش کرتی ہیں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک آدمی میں ایک ایک کوئی ایک برائی کسی از غیبی گوئے کی طرح پھٹ پڑے جس کی کوئی علامت اس کے چال چلن میں اور اس کے نگہ ٹھنک میں نہ پائی جاتی ہو۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس کا تم ہر وقت انسانی زندگیوں میں مشاہدہ کرتے دیکھتے ہو۔ اب کس طرح تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ایک پاکیزہ انسان جس کی ساری زندگی سے تم واقف ہو، کسی ایسی عورت سے نباہ کر لے اور برسوں نہایت محبت کے ساتھ نباہ کیے چلا جاتا ہے جو زنا کار ہو۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو بدکار بھی ہو اور پھر اس کی رفتار، گفتار، انداز، اطوار، کسی چیز سے بھی اس کے بڑے چھین ظاہر ہوتے ہوں؟ یا ایک شخص پاکیزہ نفس اور بلند اخلاق بھی ہو اور پھر ایسی عورت سے خوش بھی رہے جس کے یہ چھین ہوں؟ یہ بات یہاں اس لیے سمجھائی جا رہی ہے کہ آئندہ اگر کسی پر کوئی الزام لگایا جائے تو لوگ ان اصول کی طرح اسے سبب بنتے ہی زمانہ یا کریں بلکہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ کس پر الزام لگایا جا رہا ہے، کیا الزام لگایا جا رہا ہے، اور وہ کسی طرح وہاں چسپاں بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ بات لگتی ہوئی ہو تو آدمی ایک حد تک اسے مان سکتا ہے، یا کم از کم ممکن اور متوقع سمجھ سکتا ہے۔ مگر ایک انوکھی بات جس کی صداقت کی تائید کرنے والے آثار نہ ہوں نہ پائے جاتے ہوں صرف اس لیے کیسے مان لی جائے کہ کسی احمق یا خبیث نے اسے منہ سے خارج کر دیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ بڑی باتیں بڑے لوگوں کے لیے ہیں (یعنی وہ ان کے مستحق ہیں) اور بھلی باتیں بھلے لوگوں کے لیے ہیں اور بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ باتیں ان پر چسپاں ہوں جو بدگروا شخاص ان کے بارے میں کہتے ہیں۔ یعنی دوسرے لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بڑے اعمال برے ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں اور نیک اعمال نیک ہی لوگوں کو سزا داریں، نیک لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ بڑے اعمال ان پر چسپاں ہوں جو منسوب کرنے والے ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بڑی باتیں بڑے ہی لوگوں کے کرنے کی ہیں اور بھلے لوگ بھلی باتیں ہی کیا کرتے ہیں بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ اس طرح کی باتیں کریں جیسی یہ اقرا پر داز لوگ کر رہے ہیں۔ آیت کے الفاظ میں ان سب تفسیروں کی

اُسے لوگوں پر ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گنجائش ہے۔ لیکن ان الفاظ کو پڑھ کر پہلا مفہوم جو ذہن میں آتا ہے وہ وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے بھی جو معنویت اس میں ہے وہ ان دوسرے مفہومات میں نہیں ہے۔

۳۔ سورے کے آغاز میں جو احکام دینے گئے تھے وہ اس لیے تھے کہ معاشرے میں برائی رونما ہو جائے تو اس کا تدارک کیسے کیا جائے۔ اب وہ احکام دینے جا رہے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں سرے سے برائیوں کی پیدائش ہی کو روک دیا جائے اور تمدن کے طور طریقوں کی اصلاح کر کے ان اسباب کا سدباب کر دیا جائے جن سے اس طرح کی خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان احکام کا مطالعہ کرنے سے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں :-

اول یہ کہ واقعہ انک پر تبصرہ کرنے کے معاً بعد یہ احکام بیان کرنا صاف طور پر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شخصیتیں میں زبردتہ رسول جیسی بلند شخصیت پر ایک صریح بہتان کا اس طرح معاشرے کے اندر نفوذ کر جانا دراصل ایک شہوانی ماحول کی موجودگی کا نتیجہ تھا، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شہوانی ماحول کو بدل دینے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ لوگوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف آنا جانا بند کیا جائے اجنبی عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی دید سے اور آزادانہ میل جول سے روکا جائے، عورتوں کو ایک بے بی حلقہ کے سوا غیر محرم رشتہ داروں اور اجنبیوں کے سامنے زینت کے ساتھ آنے سے منع کر دیا جائے، عقیدہ گری کے پیشے کا قطعی انہاد کیا جائے، مردوں اور عورتوں کو زیادہ دیر تک مجبور نہ رہنے دیا جائے، اور لڑکیوں کو لڑکوں کے حجرہ کا ملاوا کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ عورتوں کی بے پردگی، اور معاشرے میں بکثرت لوگوں کا مجبور رہنا، اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ بنیادی اسباب ہیں جن سے اجتماعی ماحول میں ایک غیر محسوس شہوانیت ہر وقت ساری و جاری رہتی ہے اور اسی شہوانیت کی بدولت لوگوں کی آنکھیں، ان کے کان، ان کی زبانیں، ان کے دل، سب کے سب کسی واقعی یا خیالی فتنے (SCANDAL) میں پٹنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس خرابی کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ان احکام سے زیادہ زیادہ صحیح و مناسب اور مؤثر کوئی دوسری تدبیر نہ تھی، ورنہ وہ ان کے سوا کچھ دوسرے احکام دیتا۔

گھر والوں کی رضائے کو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو، یہ طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے، توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔ پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی

دوسری بات جو اس موقع پر سمجھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ شریعت الہی کسی برائی کو محض حرام کر دینے، یا اسے جرم قرار دے کر اس کی سزا مقرر کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ وہ ان اسباب کا بھی خاتمہ کر دینے کی فکر کرتی ہے جو کسی شخص کو اس برائی میں مبتلا ہونے پر آمادہ کرتے ہوں، یا اس کے لیے مواقع بہم پہنچاتے ہوں، یا اس پر مجبور کر دیتے ہوں۔ نیز شریعت جرم کے ساتھ اسباب جرم، محرکات جرم اور وسائل و ذرائع جرم پر بھی پابندیاں لگاتی ہے تاکہ آدمی کو اصل جرم کی عین مرحلہ پر پہنچنے سے پہلے کافی فاصلے ہی پر روک دیا جائے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی کہ لوگ ہر وقت جرم کی سرحدوں پر ٹپکتے رہیں اور روز پکڑے جائیں اور سزائیں پایا کریں۔ وہ صرف محتسب (PROSECUTOR) ہی نہیں ہے بلکہ ہمدرد، مصلح اور مددگار بھی ہے، اس لیے وہ تمام تعلیمی اخلاقی اور معاشرتی تدابیر اس غرض کے لیے استعمال کرتی ہے کہ لوگوں کو ریشموں سے بچنے میں مدد دی جائے۔

۱۱۔ اصل میں لفظ حتیٰ تستناسوا استعمال ہوا ہے جس کو عموماً لوگوں نے حتیٰ تستناد ذلوا کے معنی میں لے لیا ہے لیکن درحقیقت دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اگر حتیٰ تستناد ذلوا فرمایا جاتا تو آیت کے معنی یہ ہوتے کہ "لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو" اس طرز تعبیر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے حتیٰ تستناسوا کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ استیناس کا مادہ انس ہے جو اردو زبان میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں عربی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مادہ سے استیناس کا لفظ جب بولیں گے تو اس کے معنی ہونگے انس معلوم کرنا یا اپنے سے مانوس کرنا پس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ "لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ ان کو مانوس نہ کر لو یا ان کا انس معلوم نہ کرو" یعنی یہ معلوم نہ کرو کہ تمہارا آنا صاحب خانہ کو ناگوار تو نہیں ہے، وہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کے گھر میں داخل ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ "اجازت لینے" کے بجائے "رضائے لینے" کے الفاظ سے کیا ہے کیونکہ یہ مفہوم اصل سے قریب تر ہے۔

۱۲۔ جاہلیت میں اہل عرب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حیثیت مباحا، حیثیت مساذر صبح بخیر، شام بخیر کہتے ہوئے بے تکلف ایک دوسرے کے گھر میں گھس جاتے تھے اور بااوقات گھر والوں پر اور ان کی عورتوں پر

نادیدنی حالت میں نگاہیں پڑ جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح کے لیے یہ اصول مقرر کیا کہ ہر شخص کو اپنے رہنے کی جگہ میں تنگی (PRIVACY) کا حق حاصل ہے اور کسی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے تنگی میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر دخل انداز ہو۔ اس حکم کے نازل ہونے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے میں جو آداب اور قواعد جاری فرمائے انہیں ہم ذیل میں میں نمبر وار بیان کرتے ہیں:-

۱۱) حضور نے تنگی کے اس حق کو صرف گھر میں داخل ہونے کے سوال تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عام حق قرار دیا جس کی رو سے دوسرے کے گھر میں جھانکنا، باہر سے نگاہ ڈالنا، حتیٰ کہ دوسرے کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ حضرت ثوبان (رضی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا: اِذَا دَخَلَ الْبَيْتَ فَلَا اِذْنَ، جب نگاہ داخل ہوگئی تو پھر خود داخل ہونے کے لیے اجازت مانگنے کا کیا موقع رہا؟ (ابوداؤد)۔ حضرت ہزبل بن شریبیل کہتے ہیں ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا اور عین دروازے پر کھڑا ہو کر اجازت مانگنے لگا۔ حضور نے اسے فرمایا: هَذَا اَعْنَيْكَ، فَاِنَّمَا الْاِسْتِیْذَانُ مِنَ النَّظَرِ، پھرے ہٹ کر کھڑے ہو، اجازت مانگنے کا حکم تو اسی جیسے ہے کہ نگاہ نہ پڑے۔ (ابوداؤد)۔

حضور کا اپنا قاعدہ یہ تھا کہ جب کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو دروازے کے عین سامنے کھڑے نہ ہوتے کیونکہ اس زمانے میں گھروں کے دروازوں پر پردے نہ لٹکائے جاتے تھے۔ آپ دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اجازت طلب فرمایا کرتے تھے (ابوداؤد)۔ حضرت انس خادم رسول اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت کے حجرے میں باہر سے جھانکا۔ حضور اس وقت ایک تیر ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ آپ اس کی طرف اس طرح بڑھے جیسے کہ اس کے پیٹ میں بھونک دیں گے (ابوداؤد)۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا: مَنْ نَظَرَ فِي كِتَابِ اَخِيهِ بَغِيْرًا ذَنْهًا فَاِنَّمَا بِنَظَرِي الْاِنَارَةَ، جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے خط میں نظر ڈرائی وہ گویا آگ میں جھانکتا ہے۔ (ابوداؤد)۔ صحیحین میں ہے کہ حضور نے فرمایا: لَوْ اَنَّ اَمْرًا اَطْلَعَ عَلَيْهِ بَغِيْرًا اِذْنًا فَتَدْبَحُ بَحْصًا فَفَقَاتَ عَلَيْهِ مَا كَانَ عَدِيْكَ مِنْ جَنَاحٍ، اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو ایک کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو کچھ گناہ نہیں۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں ہے: مَنْ اَطْلَعَ دَارَ قَوْمٍ بَغِيْرًا ذَنْهًا فَفَقَاتَ عَلَيْهِ فَقَدْ هَدَرَتْ عَلَيْهِ، جس نے



کسی کے گھر میں جھانکا اور گھروالوں نے اس کی آنکھ پھٹو دی تو ان پر کچھ موانذہ نہیں۔ امام شافعی نے اس ارشاد کو بالکل لفظی معنوں میں لیا ہے اور وہ جھانکنے والے کی آنکھ پھٹو دینے کو جائز رکھتے ہیں۔ لیکن حنفیہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ حکم محض نگاہ ڈالنے کی صورت میں نہیں ہے بلکہ اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص گھر میں بلا اجازت گھس آئے اور گھروالوں کے روکنے پر وہ باز نہ آئے اور گھروالے اس کی مزاحمت کریں۔ اس کشمکش اور مزاحمت میں اس کی آنکھ پھٹ جائے یا کوئی اور عضو ٹوٹ جائے تو گھروالوں پر کوئی موانذہ نہ ہو گا (احکام القرآن ج ۳ ص ۳۰۵)۔

(۲) تعقیبانے نگاہ ہی کے حکم میں سماعت کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً اندھا آدمی اگر بلا اجازت آئے تو اس کی نگاہ نہ پڑے گی، مگر اس کے کان تو گھروالوں کی باتیں بلا اجازت سنیں گے۔ یہ چیز بھی نظری کی طرح تخلیہ کے حق میں ہے جاہد مخالفت ہے۔

(۳) اجازت لینے کا حکم صرف دوسروں کے گھر جانے کی صورت ہی میں نہیں ہے بلکہ خود اپنی ماں بہنوں کے پاس جانے کی صورت میں بھی ہے۔ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا میں اپنی ماں کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا میرے سوا ان کی خدمت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے کیا ہر بار جب میں ان کے پاس جاؤں تو اجازت مانگوں؟ فرمایا اتخب ان نواہاعا یا نہ۔ کیا تو پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھے؟ (ابن جریر بن عطاء بن یسار مرسلًا) عبداللہ بن مسعود کا قول ہے علیکم ان تستنذوا علی امہاتکم و اشواتکم۔ اپنی ماں بہنوں کے پاس ہی جاؤ تو اجازت لے کر جاؤ۔ (ابن کثیر) بلکہ ابن مسعود تو کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے پاس جاتے ہوئے بھی آدمی کو کم از کم غصکار دینا چاہیے۔ ان کی بیوی زینب کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جب کبھی گھر میں آئے مگتے تو پہلے کوئی ایسی آواز کر دیتے تھے جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ آ رہے ہیں۔ وہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ اچانک گھر میں آئے پھرے ہوں (ابن جریر)۔

(۴) اجازت طلب کرنے کے حکم سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کسی کے گھر پر اسپانک کوئی مصیبت آجائے۔ مثلاً آگ لگ جائے یا کوئی چوگھس آئے۔ ایسے واقعے پر مدد کے لیے بلا اجازت جاسکتے ہیں۔

(۵) اول اول حسب استیذان کا قاعدہ مقرر کیا گیا تو لوگ اس کے آواہ سے واقف نہ تھے ایک دفعہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آیا اور دروازے پر سے پکار کر کہنے لگا اُجج (کہا میں گھس آؤں؟) نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنی لونڈی روفنہ سے فرمایا یہ شخص اجازت مانگنے کا طریقہ نہیں جانتا۔ ذرا اٹھ کر اسے بتا کہ یوں کہتا چاہیے السلام علیکم۔ اُدْخُلْ رَاٰبِنَ حَبْرَةَ - ابو داؤد۔ جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں اپنے مرحوم والد کے قرضوں کے سلسلے میں آنحضرت کے ہاں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا میں ہوں۔ آپ نے دو تین مرتبہ فرمایا میں ہوں؟ میں ہوں؟ یعنی اس میں ہوں سے کوئی کیا سمجھے کہ تم کون ہو؟ ابو داؤد۔ ایک صاحب مکدہ بن تنبل ایک کام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گئے اور سلام کیے بغیر لوہی جا بیٹھے۔ آپ نے فرمایا باہر جاؤ، اور السلام علیکم کہہ کر اندر آؤ (ابو داؤد)۔ استنید ان کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آدمی اپنا نام بتا کر اجازت طلب کیے حضرت عمر کے متعلق روایت ہے کہ وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے السلام علیک یا رسول اللہ۔ ابیدخل نعمد ابو داؤد۔ اجازت لینے کے لیے حضور نے زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ پکارنے کی حد مقرر کر دی اور فرمایا اگر تیسری مرتبہ پکارنے پر بھی جواب نہ آئے تو واپس ہو جاؤ (بخاری، مسلم، ابو داؤد) یہی حضور کا اپنا طریقہ بھی تھا۔ ایک مرتبہ آپ حضرت سعد بن عبد وہ کے ہاں گئے اور اسلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ کر دو دفعہ اجازت طلب کی، مگر اندر سے جواب نہ آیا۔ تیسری مرتبہ جواب نہ ملنے پر آپ واپس ہو گئے حضرت سعد اندر سے دوڑ کر آئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ میں آپ کی آواز سن رہا تھا، مگر میرا جی چاہتا تھا کہ آپ کی زبان مبارک سے میرے لیے جنتی بار بھی سلام و رحمت کی دعا نکل جائے اچھا ہے، اس لیے میں بہت آہستہ آہستہ جواب دینا رہا (ابو داؤد۔ احمد)۔ یہ تین مرتبہ پکارنا پیسے درپے نہ ہونا چاہیے، بلکہ ذرا ٹھہر ٹھہر کر پکارنا چاہیے تاکہ صاحب خانہ کو اگر کوئی مشغولیت جواب دینے میں مانع ہو تو اسے فارغ ہونے کا موقع مل جائے۔

(۶) اجازت یا تو خود صاحب خانہ کی معتبر ہے یا پھر کسی ایسے شخص کی جس کے متعلق آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو کہ وہ صاحب خانہ کی طرف سے اجازت دے رہا ہے، مثلاً گھر کا خادم یا کوئی اونٹن و موہ و اقسام کا فرد۔ کوئی چھوٹا سا بچہ اگر کہہ دے کہ آ جاؤ تو اس پر اکتفا کر کے داخل نہ ہو جانا چاہیے۔

(۷) اجازت طلب کرنے میں بے جا اصرار کرنا، یا اجازت نہ ملنے کی صورت میں دروازے پر جھمکے مٹھے سے ہوجانا جائز نہیں ہے۔ اگر تین دفعہ استنید ان کے بعد صاحب خانہ کی طرف سے اجازت نہ ملے، یا وہ ملنے سے انکار کر دے تو واپس چلے جانا چاہیے۔

جائے، اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ، یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کچھ تم کرنے ہو اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ اللہ تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے زیادہ کام کی کوئی چیز ہو، تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو سب کی اللہ کو خبر ہے۔

اسے نبی، مومن مردِ عمل سے کہو کہ اپنی نظریں پچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔

۶۷ یعنی کسی کے خالی گھر میں داخل ہو جانا جائز نہیں ہے، الایہ کہ صاحبِ خانہ نے آدمی کو خود اس بات کی اجازت دی ہو۔ مثلاً اس نے آپ سے کہہ دیا ہو کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو آپ میرے کمرے میں بیٹھ جائیے گا، یا وہ کسی اور جگہ پر ہو اور آپ کی اطلاع ملنے پر وہ کہلا بھیجے کہ آپ تشریف رکھیے، میں ابھی آتا ہوں۔ ورنہ محض یہ بات کہ مکان میں کوئی نہیں ہے، یا اندر سے کوئی نہیں بولتا، کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ بلا اجازت داخل ہو جائے۔

۶۸ یعنی اس پر بُرا نہ ماننا چاہیے۔ ایک آدمی کو حق ہے کہ وہ کسی سے نہ ملنا چاہے تو انکار کر دے، یا کوئی مشوریت ملاقات میں مانع ہو تو معذرت کر دے۔ (اِنْ جِئُوا دِوَابِسَ هُوَ جَاؤُ) کے حکم کا فقہاء نے یہ مطلب لیا ہے کہ اس صورت میں دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے کی اجازت نہیں ہے بلکہ آدمی کو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو ملاقات پر مجبور کرے، یا اس کے دروازے پر ٹھیکرے اسے تنگ کرنے کی کوشش کرے۔

۶۹ اس سے مراد ہیں ہٹول، مہرائے، مہانِ فلانے، دوکانیں، مسافر خانے وغیرہ جہاں لوگوں کے لیے داخلہ کی عام اجازت ہو۔

۷۰ اصل میں الْفَاظِہِیْنَ یَعْنُوْنَ اَمِنْ اَنْ یُعَادِہِمُ غَضَّہِیْنَ کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کرنے، گھٹانے اور سبت کرنے کے غرضِ بصر کا ترجمہ عام طور پر نگاہِ نیچی کرنا یا رکھنا کیا جاتا ہے، لیکن دراصل اس کا مطلب ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے، بلکہ پوری طرح نگاہ بھر کر نہ دیکھنا، اور نگاہوں کو دیکھنے کے لیے بالکل آزاد نہ چھوڑ دینا

ہے۔ یہ مفہوم "نظر بچانے" سے ٹھیک ادا ہوتا ہے، یعنی جس چیز کو دیکھنا مناسب ہو اس سے نظر مہالی چلے، قطع نظر اس سے کہ آدمی نگاہ نیچی کرے یا کسی اور طرف اسے بچالے جائے۔ **مَنْ أَبْصَرَ دَهْرًا مِنْ تَبَعِيضِ كَيْفِ** ہے۔ یعنی حکم تمام نظروں کو بچانے کا نہیں ہے بلکہ بعض نظروں کو بچانے کا ہے۔ **بِالْفَاظِ وَبِكَرَامَةِ اللَّهِ تَعَالَى** کا منشا یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھا جائے، بلکہ وہ صرف ایک مخصوص دائرے میں نگاہ پر یہ پابندی عائد کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ بات سیاق و سباق سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ پابندی جس چیز پر عائد کی گئی ہے وہ ہے مردوں کا عمدتوں کو دیکھنا، یا دوسرے لوگوں کے ستر پر نگاہ ڈالنا، یا محض مناظر پر نگاہ جانا۔

کتاب اللہ کے اس حکم کی جو تشریح سنت نے کی ہے اس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:-

(۱) آدمی کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی یا اپنی محرم خواتین کے سوا کسی دوسری عورت کو نگاہ بھر کر دیکھے۔ ایک دفعہ اچانک نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے، لیکن یہ معاف نہیں ہے کہ آدمی نے پہلی نظر میں جوہاں کوئی کشش محسوس کی ہو وہاں پھر نظر دوڑائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی دیدہ بازی کو آنکھ کی بدکاری سے تعبیر فرمایا ہے آپ کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنے تمام حواس سے زنا کرتا ہے۔ دیکھنا آنکھوں کی زنا ہے۔ لگاؤ کی بات چیت زبان کی زنا ہے۔ آواز سے لذت لینا کانوں کی زنا ہے۔ ہاتھ لگانا اور ناجائز مقصد کے لیے چلنا ہاتھ پاؤں کی زنا ہے۔ بدکاری کی یہ ساری تہیدیں جب پوری ہو جکتی ہیں تب شرکاء ہیں یا تو اس کی تکمیل کر دیتی ہیں، یا تکمیل کرنے سے رہ جاتی ہیں (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔ حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا **يَا عَلِيُّ لَا تَتَّبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَإِنَّ لَكَ الْأُولَىٰ وَلَيْسَتْ لَكَ الْآخِرَةُ**، اے علی ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا پہلی نظر تو معاف ہے مگر دوسری نظر معاف نہیں (احمد، ترمذی، ابوداؤد، دارمی)۔ حضرت جریر بن عبداللہ کلبی کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اچانک نگاہ پڑ جائے تو کیا کروں۔ فرمایا فوراً نگاہ پھیر لو، یا نیچی کر لو (مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **إِنَّ النَّظْرَ سَبْعُ مِائَةِ مِائَةٍ** ابلیس مسموم، من ترکھا محافتی ابد لنتہ ایما نایجد حلاوتہ فی قلبہ، "نگاہ ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کو چھوڑ دے گا میں اس کے بدلے اسے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت

وہ اپنے دل میں پائے گا۔ (طبرانی)۔ ابوامامہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا یا مومن مسلمہ! بیظن الی محاسن امرأۃ ثم لیغض بصرہ الا اخاف الله لہ عبادۃ یجد حلاوتھا؟ جس مسلمان کی نگاہ کسی عورت کے حسن پر پڑے اور وہ نگاہ ہٹالے تو اللہ اس کی عبادت میں لطف اور لذت پیدا کر دیتا ہے۔ (مسند احمد) امام جعفر صادق اپنے والد امام محمد باقر سے اور وہ حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی فضل بن عباس (جو اُس وقت ایک نوجوان لڑکے تھے) مشعر حرام سے واپسی کے وقت حضور کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے۔ راستے سے جب عورتیں گزرنے لگیں تو فضل ان کی طرف دیکھنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے دوسری طرف پھیر دیا (ابوداؤد)۔ اسی حجۃ الوداع کا قصہ ہے کہ قبیلہ ششم کی ایک عورت راستہ میں حضور کو روک کر حج کے متعلق ایک مسئلہ پوچھنے لگی اور فضل بن عباس نے اُس پر نگاہیں گاڑ دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا منہ پکڑ کر دوسری طرف کر دیا۔ (بخاری، ابوداؤد ترمذی)

(۱۲) اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو کھلے منہ پھرنے کی عام اجازت تھی تبھی تو غرض بصر کا حکم دیا گیا، ورنہ اگر چہرے کا پردہ رائج کیا جا چکا ہوتا تو پھر نظر بچانے یا نہ بچانے کا کیا سوال۔ یہ استدلال عقلی حیثیت سے بھی غلط ہے اور واقعہ کے اعتبار سے بھی۔ عقلی حیثیت سے یہ اس لیے غلط ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پر رائج ہو جانے کے باوجود ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں جبکہ اچانک کسی عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہو جائے اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ منہ کھولے۔ اور مسلمان عورتوں میں بڑے رائج ہونے کے باوجود بہر حال غیر مسلم عورتیں تو بے پردہ ہی رہیں گی۔ لہذا محض غرض بصر کا حکم اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ عورتوں کے کھلے منہ پھرنے کو مستلزم ہے۔ اور واقعہ کے اعتبار سے اس لیے غلط ہے کہ سورہ اغراب میں احکام حجاب نازل ہونے کے بعد جو پردہ مسلم معاشرے میں رائج کیا گیا تھا اس میں چہرے کا پردہ شامل تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس کا رائج ہونا بکثرت روایات سے ثابت ہے۔ واقعہ انک کے متعلق حضرت عائشہ کا بیان جو نہایت معتبر سندوں سے مروی ہے اُس میں وہ فرماتی ہیں کہ جنگل سے واپس آکر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ وہیں پڑ کر سو گئی۔ صبح کو صفوان بن مَعطَّل وہاں سے گزرا تو دُور سے کسی کو پڑے دیکھ کر اُدھر آ گیا۔ فعرفنی حین وانی وکان قد لانی قیل

الحجاب فاستیقظت باسترجاعہ حین عرفتی فحمرت وجمی بجدبانی، ”وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا کیونکہ حجاب کے حکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکا تھا مجھے پہچان کر جب اس نے انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے منہ ڈھانک لیا (بخاری، مسلم، احمد، ابن جریر، سیرت ابن ہشام)۔ ابو داؤد، کتاب الجہاد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک خاتون اُمّ خالد کالٹر کا ایک جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق دریافت کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، مگر اس حال میں بھی چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی بعض صحابہ نے حیرت کے ساتھ کہا کہ اس وقت بھی تمہارے چہرے پر نقاب ہے؟ یعنی بیٹے کی شہادت کی خبر سن کر تو ایک ماں کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اور تم اس اطمینان کے ساتھ باپردہ آئی ہو۔ جواب میں کہنے لگیں ان اسرا ذابنی فدن اسرا حیاتی، میں نے بیٹا تو ضرور کھو دیا ہے مگر اپنی حیات تو نہیں کھو دی۔ ابو داؤد ہی میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ ایک عورت نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درخو است دی حضور نے پوچھا یہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا؟ اس نے عرض کیا عورت ہی کا ہے۔ فرمایا ”عورت کا ہاتھ ہے تو کم از کم ناخن ہی مہندی سے رنگ لیے ہوتے“ رہے حج کے موقع کے وہ دو ملائعات جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے تو وہ عہد نبوی میں چہرے کا پردہ نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتے، کیونکہ احرام کے لباس میں نقاب کا استعمال ممنوع ہے۔ تاہم اس حالت میں بھی محتاط خواتین غیر مردوں کے سامنے چہرہ کھول دینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں ہم لوگ بحالت احرام مکہ کی طرف جا رہے تھے۔ جب مسافر ہمارے پاس سے گزرتے لگتے تو ہم عورتیں اپنے سر سے چادریں کھینچ کر منہ پر ڈال لیتیں، اور جب وہ گزر جاتے تو ہم منہ کھول لیتی تھیں“ (ابو داؤد، باب فی المحرمۃ تغطی وجہہا)۔

(۳) غرض بصر کے اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی عورت کو دیکھنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو یا اس غرض کے لیے عورت کو دیکھ لینے کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ ایسا کرنا کم از کم مستحب تو ضرور ہے۔ مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے کہ میں نے ایک جگہ نکاح کا پیغام دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نے لڑکی کو دیکھ لیا ہے۔ میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا انظر ایسھا

خانہ اِحْرٰی انْ یُوْدِمَ بَیْنَکُمَا، اسے دیکھ لو۔ اس طرح زیادہ توقع کی جا سکتی ہے کہ تمہارے درمیان نفقت ہوگی، داہدہ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، ابوسریہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے کہیں شادی کا پیغام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انظروا لیہا فان فی اعین الانصار شیشا، لڑکی کو دیکھ لو، کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ خرابی ہوتی ہے، (مسلم، نسائی، احمد)۔ جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا اذنا خطب احدکم المراتۃ فقد وآن یرئی منها بعض ما یدعوہ الی نکاحھا فلیفعل، تم میں سے جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا خواہستگار ہو تو حتی الامکان اسے دیکھ کر یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ آیا عورت میں ایسی کوئی خوبی ہے جو اُس کے ساتھ نکاح کی طرف راغب کرنے والی ہو، داہدہ، ابو داؤد، مُسند احمد میں ابو حمیدہ کی روایت ہے کہ حضور نے اس غرض کے لیے دیکھنے کی اجازت کو فلا جُناح علیہ کے الفاظ میں بیان کیا، یعنی ایسا کر لینے میں مضائقہ نہیں ہے۔ نیز اس کی بھی اجازت دی کہ لڑکی کی بے خبری میں بھی اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی سے فقہانے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ بضرورت دیکھنے کی دوسری صورتیں بھی جائز ہیں۔ مثلاً تقیث جراثیم کے سلسلے میں کسی مشتبہ عورت کو دیکھنا، یا عدالت میں گواہی کے موقع پر قاضی کا کسی گواہ عورت کو دیکھنا، یا علاج کے لیے طبیب کا مریضہ کو دیکھنا وغیرہ۔

(۴) غرض بصیر کے حکم کا منشا یہ بھی ہے کہ آدمی کسی عورت یا مرد کے ستر پر نگاہ نہ ڈالے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا ینظر الرجل الی عورت الرجل ولا تنظر المرأة الی عورت المرأة، کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے، اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو نہ دیکھے، (احمد، مسلم، ابو داؤد، ترمذی)۔ حضرت علی کی روایت ہے کہ حضور نے مجھ سے فرمایا لا تنظر الی فخذ حی ولا میت، کسی زندہ یا مردہ انسان کی ران پر نگاہ نہ ڈالو، (ابو داؤد، ابن ماجہ)۔

سچے شرمگاہوں کی حفاظت سے مراد محض ناجائز شہوت رانی سے پرہیز ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے سے پرہیز بھی ہے۔ مرد کے لیے ستر کے حدود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناف سے گھٹنے تک مقرر فرمائے ہیں۔ عورت الرجل ما بین ستر الی رکتبہ، مرد کا ستر اس کی ناف سے گھٹنے تک ہے، (داؤد ظنی، بیہقی)۔ اس حصہ جسم کو بیوی کے سوا کسی کے سامنے کھولنا حرام ہے، حضرت

جو صحابہ کرامؓ، جو اصحابِ صفہ میں سے ایک بزرگ تھے، روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک دفعہ میری زبان کھلی ہوئی تھی۔ حضور نے فرمایا اما علمت ان الفخذ عورتہ؟ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ زبان چھپانے کے قابل چیز ہے؟ (ترمذی، ابوداؤد، مؤطا)۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا لا تبذرا (یا لا تکشف) فخذک؟ اپنی زبان کبھی نہ کھولو (ابوداؤد، ابن ماجہ)۔ صرف دو سروں کے سامنے ہی نہیں تنہائی میں بھی ننگا رہنا ممنوع ہے۔ چنانچہ حضور کا ارشاد ہے یا کلمہ والتعوی فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفمن الرجل الی اہلبہ، فاستخیروہم واکرموہم۔ خبردار، کبھی ننگے نہ رہو کیونکہ تمہارے ساتھ وہ ہیں جو کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے (یعنی خیر اور رحمت کے فرشتے)، سوائے اس وقت کے جب تم بیخ حاجت کرتے ہو یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو، لہذا ان سے شرم کرو اور ان کا احترام ملحوظ رکھو (ترمذی)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا اِحفظ عورتک الا من زوجتک او ما ملکت یمینک؛ اپنے ستر کو اپنی بیوی اور لوزنڈی کے سوا ہر ایک سے محفوظ رکھو۔ سائل نے پوچھا اور جب ہم تنہائی میں ہوں؟ فرمایا فاللہ تبارک وتعالیٰ احق ان یتخبیا منہ۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔

(ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔